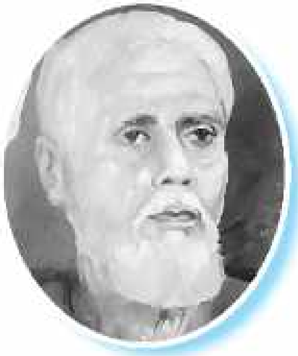

قدرت اللہ شہاب

قدرت اللہ شہاب ۱۹۱۷ء میں گلگت میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے پرنس آف ویلز کالج جموں سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور بعد میں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ ۱۹۴۰ء میں انہوں نے انڈین سول سروس کا امتحان پاس کیا اور بنگال میں تعینات ہوئے۔ تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان آئے۔ پہلے منسٹری آف کامرس میں ڈپٹی سیکرٹری اور بعد میں مظفر آباد آزاد کشمیر میں چیف سیکرٹری تعینات ہوئے۔ وہ سابق صدور اسکندر مرزا اور ایوب خان کے پرنسپل سیکرٹری بھی رہے۔ کچھ عرصہ نیدر لینڈ میں پاکستان کے سفیر رہے۔

قدرت اللہ شہاب نے بچپن ہی سے اُردو اور انگریزی میں لکھنا شروع کیا۔ سولہ سال کی عمر میں انہوں نے ریڈر ڈائجسٹ لندن کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے مضمون نویسی کے مقابلے میں حصہ لیا اور پہلا انعام حاصل کیا۔ عرصہء دراز تک وہ پاکستان کے کئی اخبارات اور میگزین کے لیے اُردو اور انگریزی میں مضامین لکھتے رہے۔

اُن کی اہم تصنیف ''شہاب نامہ'' ہے جو وہ آخری عمر تک لکھتے رہے اور جو اُن کی موت کے بعد شائع ہوئی۔ اس کی اشاعت میں اُن کے قریبی ساتھی مسعود مفتی نے اہم کردار ادا کیا۔

۱۹۸۶ء میں انہوں نے اسلام آباد میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

کراچی کی طوطا کہانی

(قدرت اللہ شہاب)

مقاصدِ تدریس

۱۔ طلبہ کو قدرت اللہ شہاب کے اسلوب نثر سے آگاہ کرنا۔

۲۔ اُردو ادب میں سوانح عمری کی اہمیت بتانا۔

۳۔ طلبہ کو نوزائیدہ مملکتِ خداداد پاکستان کی مشکلات سے آگاہ کرنا۔

مشکل الفاظ: انضباطی ، زود رنجی ، کج کلاہی ، حفظِ ماتقدم ، شُد بُد ، تلملاہٹ

اگست کے شروع میں کٹک سے کراچی پہنچنے کے سارے رستے مسدود ہو چکے تھے۔ جُوں تُوں کر کے میں کسی نہ کسی طرح بنگال ناگ پور ریلوے کے ذریعے ۱۲ ستمبر کو بمبئی پہنچ گیا اور اگلے روز ایئر انڈیا کے ہوائی جہاز سے کراچی آ گیا۔

جب انڈیا کا وائی کاؤنٹ جہاز کراچی کے ہوائی اڈے پر لینڈ ہوا تو میرا خیال تھا کہ ہم سب مسافر ارضِ پاک پر سر کے بل اُتریں گے اور اترتے ہی اپنی جان اور ایمان سلامت لے آنے پر باجماعت سجدۂ شکرانہ ادا کریں گے، لیکن جہاز سے نکلتے ہی ہمیں نفسانفسی کے آسیب نے دبوچ لیا اور ہم ایک دوسرے سے ٹکراتے، ایک دوسرے کو پچھاڑتے، ایک دوسرے سے دھکم دھکا ہوتے اپنے اپنے سامان کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔ سامان وصول کر کے ہم اسے سینے سے لگا کر بیٹھ گئے اور آج تک اسی سامان کو بڑھانے، سجانے، چمکانے میں دل و جان سے مصروف ہیں۔ جو سجدۂ شکرانہ کراچی ایئر پورٹ پر قضا ہو گیا تھا، سامان کے جھمیلے میں وہ اب تک واجب الادا چلا آ رہا ہے.....

''کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر!''

وزارتِ تجارت، صنعت اور ورکس، چیف کورٹ بلڈنگ میں واقع تھی۔ مسٹر آئی۔ آئی چندریگر وزیر، مسٹر

میک فارقر سیکرٹری اور مسٹر شجاعت علی حسنی جائنٹ سیکرٹری تھے ۔ انڈر سیکرٹری کے طور پر مجھے امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ سیکشن کا چارج دیا گیا ۔ میرے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ تجارت کسے کہتے ہیں اور برآمدات اور درآمدات کس چڑیا کا نام ہے۔ بندر روڈ پر ایک کباڑیے کی دکان سے میں نے ایک انٹرنیشنل ٹریڈ ڈائریکٹری اور ایک سیکنڈ ہینڈ فلپس اٹلس خریدی اور اللہ کا نام لے کر اپنا کام شروع کر دیا۔

کام کرنے کے لیے مجھے ایک چھوٹا سا کیبن ملا ہوا تھا۔ پہلے روز اُس میں فقط ایک میز تھی ۔ دوسرے روز ایک کرسی بھی مل گئی۔ چند روز بعد ایک دو کرسیاں اور بھی آگئیں ۔ فائلوں کے لیے کاغذ، پن، ٹیگ کبھی دفتر سے مل جاتے تھے، کبھی ناغہ ہو جاتا تھا۔ اُس روز میں یہ اشیاء بازار سے خود خرید لاتا تھا۔

اُن دنوں پاکستان میں اچانک چینی اور کوئلے کی شدید قلت پیدا ہوگئی۔ چینی کی جگہ تو خیر لوگوں نے گُڑ کا استعمال شروع کر دیا اور کراچی میں جابجا طرح طرح کا گُڑ ریڑھیوں پر بکنے لگا، لیکن کوئلے کی کمی بڑی باعثِ تشویش تھی ۔ اُس وقت ہماری سب ریل گاڑیاں کوئلے سے چلتی تھیں اور اس کی قلت سے رسل و رسائل کے سارے نظام کے معطل ہو جانے کا شدید خدشہ تھا۔ اس صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے چندریگر صاحب نے متعلقہ وزارتوں کے افسروں کی ایک ہنگامی میٹنگ منعقد کی ۔ میں سیکنڈ ہینڈ فلپس اٹلس اور انٹرنیشنل ٹریڈ ڈائریکٹری کی مدد سے اپنا ہوم ورک کر کے گیا تھا ،اس لیے میری چند تجاویز بڑی سہولت سے منظور ہوگئیں۔اس سے میرے وزیر، سیکرٹری، جائنٹ سیکرٹری کو غالباً یہ خوش فہمی ہوگئی کہ مجھے بین الاقوامی تجارت کے معاملات پر کوئی خاص عبور حاصل ہے،معاشیات اور فن اعداد و شمار پر کئی کتابیں خرید کر چند روز میں پڑھ ڈالیں اور محکمانہ میٹنگوں میں زبانی کلامی حد تک دخل در معقولات دینے کی شُد بُد حاصل کر لی۔

ایک روز کامرس سیکرٹری مسٹر میک فارقر نے امپورٹ ایکسپوٹ سیکشن کی ایک فائل طلب کی ۔ بڑی ڈھنڈیا پڑی، لیکن فائل ملنی تھی نہ ملی۔ میرے سیکشن کے اسسٹنٹ سیکرٹری اور سپرنٹنڈنٹ نے چھان بین کے بعد سارا الزام اپنے ایک اسسٹنٹ کے سر تھوپ دیا کہ مطلوبہ فائل اس کی لاپروائی سے گُم ہوگئی ہے۔ساتھ ہی انھوں نے اپنے نوٹ میں یہ بھی لکھا کہ یہ اسسٹنٹ لااُبالی قسم کا منہ زور اور منہ پھٹ قسم کا انسان ہے۔ دفتری دستور العمل کی چنداں پابندی نہیں کرتا۔ اب اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کے خلاف سخت انضباطی اور تادیبی کاروائی کر کے قرار واقعی سزا ضرور دینی چاہیے۔

میں نے ''ملزم'' کو اپنے کمرے میں طلب کیا، تو ایک خوش پوش، بانکا ترچھا، گورا چٹا چھریرے بدن کا جوان لٹکتا مٹکتا بے اعتنائی سے آیا اور دونوں کُہنیاں میز پر ٹیک کر سامنے والی کرسی پر یوں بیٹھ گیا جیسے وہ خود میری جواب طلبی کرنے والا ہو۔ مَیں نے اُس سے فائل کے متعلق دریافت کیا' تو اُس نے بے حد رُکھائی سے بے حد مختصر جواب دیا ''مل نہیں رہی۔''

''کیوں نہیں مل رہی؟'' مَیں نے بھی لہجے میں تیزی پیدا کر کے کہا۔

''گُم ہو گئی۔'' اسسٹنٹ نے وضاحت کی۔

''کیسے گُم ہو گئی؟'' مَیں نے اور بھی تیزی سے پوچھا۔

''بس جی گُم ہو گئی، بتا کے تو نہیں گئی۔'' اسسٹنٹ نے اپنے بائیں ہاتھ کی پُشت ناک پر رگڑ کر گُھوں گُھوں کیا اور جس طرح لٹکتا مٹکتا کمرے میں داخل ہوا تھا، اسی طرح لٹکتا مٹکتا واپس چلا گیا۔

یہ ٹکا سا جواب سُن کو مَیں کچھ دیر کے لیے سنّاٹے میں آ گیا۔ رفتہ رفتہ مجھے اپنے سوال کی حماقت اور اسسٹنٹ کے جواب کی بے ساختہ معقولیت پر ہنسی آنے لگی۔ اگر ہر لاپتہ چیز یہ اعلان کر کے جائے کہ وہ کیسے گُم ہو رہی ہے تو گمشدگی کے واقعات ہی کیوں رونما ہوں؟

وہ دن اور آج کا دن، جمیل الدین عالیؔ سے میرے تعلقات کچھ اسی نوعیت کے خطوط پر استوار چلے آ رہے ہیں، کیونکہ امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ سیکشن کا الھڑ، بے باک اور منہ زور اسسٹنٹ جو فائل گُم کر بیٹھا تھا، جمیل الدین عالیؔ ہی تھا۔ مَیں اس واقعہ کو اپنی زندگی کا بڑا قیمتی اور خوشگوار حادثہ سمجھتا ہوں۔ اس کی بدولت مجھے عالیؔ کی دوستی اور رفاقت کا شرف حاصل ہوا، جس کے خوبصورت دوہوں اور ملّی نغموں نے مجھے شاد کام کیا ہے۔ جس کے خلوص کی دولت نے مجھے مالا مال کیا ہے اور جس کی نازک مزاجی، زُود رنجی، تلملاہٹ، جُھنجلاہٹ اور کج کلاہی نے میرے دل میں کبھی کوئی آزردگی پیدا نہیں کی۔

وزارتِ تجارت میں کام کرتے ہوئے مجھے مشکل سے ایک مہینہ ہوا تھا، کہ جموں و کشمیر میں آزادی کی لہر اٹھی اور اس کے ساتھ ہی مہاراجہ ہری سنگھ کی قیادت میں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہو گیا۔ ماں جی اور دوسرے عزیز جموں سے جان بچا کر سیالکوٹ اُٹھ آئے۔ اب مجھے کراچی میں مکان کی فوری ضرورت پڑ گئی تا کہ انہیں اپنے پاس لے آؤں۔ ہماری منسٹری میں ایک صاحب ورکس ڈویژن کے جائنٹ سیکرٹری تھے۔ سرکاری ملازمین کو مکان

دینے کے سلسلے میں وہ مختارِ کُل تھے۔ میرے کئی جاننے والوں کو وہ بڑی شفقت اور عنایت سے مکان الاٹ بھی کر چکے تھے۔ میں نے اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی ضرورت بیان کی تو انہوں نے بڑی رُکھائی سے ٹکا سا جواب دے دیا۔ مَیں نے چند افسروں کے نام گنوائے جنہیں وہ حال ہی میں مکان فراہم کر چکے تھے، تو انہوں نے لاتعلقی سے انگریزوں کی طرح اپنے شانے اچکائے اور پھر عینک لگا کر فائلیں دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔

تھوڑی بہت دوڑ دھوپ کے بعد مجھے جواہر لال نہرو روڈ پر (جو اب قائداعظمؒ کے مزار کے سامنے ہے) ایک مکان کا نچلا حصہ کرائے پر مل گیا۔ اوپر والی منزل میں ہندو مالک مکان خود رہتا تھا۔ اُس نے اپنا خاندان اور مال واسباب تو بھارت بھیج دیا تھا اور اب مکان اور دکان کو اچھی قیمت پر فروخت کرنے کے انتظار میں یہاں رُکا ہوا تھا۔ ساٹھ ستر کا یہ بُڈھا بڑا سخت گیر مالک مکان ثابت ہوا۔ ایک تو اُس نے تین چار کمروں کا کرایہ ایسا گس کے لگایا کہ اس میں میری آدھی تنخواہ صاف نکل جاتی تھی۔ دوسرے وہ بجلی اور پانی کے استعمال پر نہایت کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ آدھی رات کو بھی ضرورتاً کسی کمرے کی بجلی جلائی جائے تو سوئے ہوئے مالک مکان کی چھٹی حِس فوراً بیدار ہو جاتی تھی اور وہ واویلا مچانا شروع کر دیتا تھا کہ ''بتی بند کرو، بتی بند کرو۔ بجلی مفت نہیں ملتی کہ ساری ساری رات جلا کر عیش کیا جائے۔'' ایک روز مالک مکان کہیں سے گھوم کر واپس گھر آیا، تو ماں جی برآمدے میں بیٹھی اپنے بال سُکھا رہی تھیں۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے ان کو بے نقط سنانی شروع کر دیں کہ مَیں تو نلکا بند کر کے گیا تھا، میری غیر حاضری میں پانی کھول کر نہائی کیوں ہو؟ ماں جی نے ہزار سمجھایا کہ انہوں نے نلکا نہیں کھولا بلکہ صبح سے اپنے لیے پانی کی بالٹی بھر کر رکھی ہوئی تھی، لیکن اس شریف آدمی کو بالکل یقین نہ آیا اور اس نے مسلمانوں کے جھوٹ، فریب اور مکر پر بڑا سیر حاصل تبصرہ کیا۔

انہی دنوں کراچی میں ہلکا سا ہندو مُسلم فساد ہو گیا۔ کچھ سامان بیچ باچ کر ہمارے مالک مکان نے ڈھائی لاکھ روپیہ نقد جمع کیا ہوا تھا۔ اسے خدشہ محسوس ہوا کہ اگر مسلمانوں نے اس کے مکان پر حملہ کیا تو نقدی بھی لُٹ جائے گی۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر وہ یہ پونجی ماں جی کے پاس امانت رکھنے کے لیے آیا۔ وہ روپے گِن کر دینا چاہتا تھا، لیکن ماں جی کو دس کے بعد گنتی ہی نہ آتی تھی۔ اس لیے مجھے سامنے بٹھا کر اُس نے ڈھائی لاکھ روپیہ دوبارہ گِنا اور اُسے ایک چمڑے کی تھیلی میں تالا لگا کر ماں جی کے حوالے کر دیا۔ مجھ سے اس کی رسید لکھوا کر اپنے پاس محفوظ کر لی۔

ماں جی نے اس امانت کی بڑی رکھوالی کی۔ رات کو وہ اس تھیلی کو اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر سوتی تھیں۔ نماز کے لیے بھی وہ اسے اپنے گھٹنے کے ساتھ لگا کر بیٹھتی تھیں۔ دو تین روز میں امن وامان قائم ہوگیا۔ بڈھے مالک مکان نے مجھے پھر سامنے بٹھا کر ڈھائی لاکھ روپیہ دوبارہ گِنا۔ رسید مجھے لوٹائی اور اپنی امانت بغل میں دبا کر اوپر والی منزل میں واپس چلا گیا۔

مالک مکان نے ایک طوطا بھی پال رکھا تھا، جسے اُس نے سندھی زبان میں چند گالیاں بڑے شوق سے سکھا رکھی تھیں۔ باہر جاتے وقت وہ طوطے کا پنجرہ ماں جی کی رکھوالی میں دے جاتا تھا۔ جب کوئی گھر والا طوطے کے سامنے سے گزرتا تھا، تو وہ بڑی بے تکلفی سے اسے اپنی مخصوص گالیاں سنا دیتا تھا۔ اپنے کام کاج سے فارغ ہوکر جب بڈھا گھر واپس لوٹتا تھا، تو ماں جی اکثر اسے چائے یا شربت بنا دیتی تھیں۔ اس کے بعد وہ طوطے کا پنجرہ لے کر اوپر چلا جاتا، اور تازہ دم ہوکر پھر ہمیں بجلی اور پانی سے محروم کرنے کے عمل میں مصروف ہوجاتا تھا۔

ایک روز چندریگر صاحب کی طبیعت ناساز تھی۔ انہوں نے مجھے ٹیلی فون کیا کہ مَیں اُن کے دفتر میں پڑی ہوئی سب فائلیں لے کر اُن کے گھر آجاؤں۔ مجھے اُن کے گھر کا پتہ معلوم نہ تھا۔ جب مَیں نے اُن سے گھر کا پتہ پوچھا تو وہ بڑی حیرت سے بولے ''تعجب ہے تمہیں اپنے منسٹر کا گھر تک معلوم نہیں؟''

میں اس بات کا کیا جواب دیتا؟ مجھے اپنے یا دوسرے وزیروں کے گھر اس وقت معلوم تھے، نہ کبھی بعد میں معلوم کرنے کا شوق چرایا ہے۔

چندریگر صاحب کے دفتر میں تیس چالیس فائلوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ مَیں نے انہیں سمیٹ کر گھوڑا گاڑی میں ڈالا اور وزیر صاحب کے بنگلے کی راہ لی۔ کوٹھی پر پولیس کا پہرہ تھا۔ انہوں نے گھوڑا گاڑی کو اندر جانے سے روک دیا کیونکہ وزیروں کی کوٹھیوں کے اندر صرف موٹر کاروں ہی کو باریابی کا شرف حاصل ہوتا ہے۔

چندریگر صاحب باہر لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے پاس سردار عبدالرب نشتر بھی تشریف فرما تھے۔

''آپ سٹاف کار میں کیوں نہیں آئے؟'' چندریگر صاحب نے پوچھا۔

''سٹاف کار فارغ نہ تھی۔'' مَیں نے جواب دیا۔

چندریگر صاحب نے یکے بعد دیگرے دو تین افسروں کے نام لیے اور بولے ''ہاں اُن میں سے کسی کے بچّوں کو کلفٹن کی سیر کرانے گئی ہوگی۔''

کسی وجہ سے چندریگر صاحب مجھے مسٹر سوہاب کہا کرتے تھے۔ انہوں نے نشتر صاحب سے میرا تعارف یوں کرایا ''یہ میرے انڈر سیکرٹری مسٹر سوہاب ہیں، جو اپنے وزیر کا گھر تک نہیں جانتے۔''

''سحاب آپ کا تخلص ہے؟'' نشتر صاحب نے دلچسپی کے انداز میں پوچھا۔

میں نے انہیں اپنا پورا نام بتایا، تو نشتر صاحب پیشانی سُکیڑ کو کچھ سوچ میں پڑ گئے اور بولے ''کیا ہم پہلے کبھی مل چکے ہیں؟ مجھے اس نام سے کسی قدر شناسائی کی بُو آتی ہے۔''

میں نے عرض کیا کہ اس سے پہلے مجھے اُن کی نیاز مندی کا شرف حاصل نہیں ہوا۔

نشتر صاحب نے میرے سروس کیریئر کے متعلق پے در پے چند سوال پوچھے۔ جب قحطِ بنگال کی بات آئی تو وہ یکایک چونکے اور فرمایا ''ہاں، ہاں، خوب یاد آیا، ایک بار دہلی میں شہید سہروردی نے آپ کی کچھ مزے کی باتیں سنائی تھیں۔''

چندریگر صاحب کی ہدایت کے مطابق مَیں نے کامرس، ورکس اور انڈسٹریز ڈویژنوں کی فائلیں چھانٹ چھانٹ کر الگ کر کے رکھ دیں تو نشتر صاحب بھی فارغ ہو کر چلنے کو تیار تھے۔ انہوں نے ازراہِ نوازش مجھے اپنی کار میں لفٹ دینے کی پیشکش کی۔

راستے میں ایک مقام پر کچھ ہندو خاندان آٹھ دس اُونٹ گاڑیوں پر اپنا سامان لادے بندرگاہ کی طرف جارہے تھے۔ نشتر صاحب نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا ''یہ لوگ کتنے آرام سے اپنا تنکا تنکا سمیٹ کر یہاں سے لے جارہے ہیں۔ اُس طرف سے ہمارے لوگ جس حالت میں یہاں پہنچتے ہیں' اُس کے تصور سے بھی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔''

نشتر صاحب کی تفننِ طبع کے لیے مَیں نے انہیں اپنے ہندو لینڈ لارڈ کے کچھ لطیفے سنائے تو وہ حیرت سے بولے ''آپ کرائے کے مکان میں رہتے ہیں؟ لینڈ لارڈ کیا کرایہ وصول کرتا ہے؟''

''تقریباً آدھی تنخواہ۔'' میں نے بتایا۔

''سرکاری مکان کیوں نہیں ملا؟'' انہوں نے پوچھا۔

میں نے خلیلی صاحب کی مجبوریاں اور معذوریاں بیان کیں تو وہ خاموش ہو گئے۔ دو تین روز کے بعد نشتر صاحب کا پی۔ اے میرے دفتر آیا اور لارنس روڈ پر نوشیروان جی مہتہ بلاک کے ایک فلیٹ کا الاٹمنٹ آرڈر میرے

حوالے کر گیا۔ مجھے آج تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ فلیٹ انہوں نے میرے لیے کس طرح حاصل کیا، لیکن اُس وقت اس گھر کا ملنا میرے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اُس جہان میں بھی خوش رکھے۔

لارنس روڈ والے فلیٹ میں دو بڑے بیڈروم اور ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ بسا اوقات اس میں ہم تیس تیس پینتیس پینتیس لوگ گزارہ کرتے تھے۔ بہت سے عزیز و اقارب اور دوست احباب بھارت اور کشمیر سے جان بچا کر ہمارے پاس پہنچ رہے تھے۔ سب کے سب انتہائی خستہ حالی اور درماندگی کا شکار تھے۔ کوئی پاپیادہ قافلوں کے ساتھ مہینوں کے سفر کے بعد پاکستان پہنچا تھا۔ کوئی اُن گاڑیوں پر سوار تھا جنہیں جابجا روک کر لوٹا مارا جاتا تھا۔ کوئی طویل عرصے تک مہاجر کیمپوں کی دلدل میں دھنسا رہا تھا۔ کسی کو کپڑوں کی حاجت تھی، کسی کو علاج معالجے کی ضرورت تھی اور زندگی کے ساتھ ازسرِنو ناطہ جوڑنے کے لیے سب ایک دوسرے کے محتاج تھے۔ ایک روز میں نے اپنا بٹوہ کھولا، تو اُس میں فقط سولہ روپے موجود تھے۔ مجھے بڑی تشویش لاحق ہوئی، کیونکہ ابھی مہینہ پورا نہیں ہوا تھا اور اگلی تنخواہ میں آٹھ دس روز باقی تھے۔

اُس زمانے میں میرے پاس کوئی بینک بیلنس نہ تھا، بلکہ اُس وقت تک مَیں نے سرے سے کوئی بینک اکاؤنٹ ہی نہ کھولا تھا۔ بہار، بنگال اور اڑیسہ میں میرا قاعدہ تھا کہ میں پہلی تاریخ کو اپنی تنخواہ نقد وصول کرتا۔ کچھ پیسے ماں جی کو جموں بھیج دیتا تھا اور باقی رقم مہینے کے آخر تک ٹھکانے لگا دیتا تھا۔ اب جو مَیں نے دیکھا کہ گھر میں دو ڈھائی درجن مہمان اور بٹوے میں صرف سولہ روپے موجود ہیں، تو میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ میرا واحد اثاثہ اورنیٹل لائف انشورنس کمپنی کی ایک انشورنس پالیسی تھی، جو چند سال قبل میں نے بھاگلپور میں خریدی تھی۔ میں اپنی پالیسی لے کر کراچی اورنیٹل انشورنس کمپنی کے دفتر گیا اور منیجر سے کہا کہ واجب الادا رقم وصول کر کے میں بیمہ کی پالیسی سے دست بردار ہونا چاہتا ہوں۔ منیجر نے مجھے مشورہ دیا کہ میں یہ بیمہ پالیسی سنبھال کر اپنے پاس رکھوں اور اس سے دست برداری کا خیال دل سے نکال دوں۔

میں نے منیجر کی کاروباری فراست کی تعریف کی، لیکن دست برداری کے ارادہ پر مستقل مزاجی سے اڑا رہا۔ کچھ مزید ردوکد کے بعد منیجر نے حساب جوڑا، اور پالیسی واپس لے کر مجھے تین ہزار سات سو روپے ادا کر دیئے۔

یہ گراں قدر رقم ہاتھ میں آتے ہی تہی دستی کے لمحات کی یاد کافور کی طرح اڑ گئی اور میرا دماغ ازسرِنو آسمان

سے باتیں کرنے لگا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کہیں سے کوئی سستی سی سیکنڈ ہینڈ موٹر کار مل جائے تو بڑا آرام نصیب ہو۔ اُڑیسہ میں میرے پاس بڑی سمارٹ اور بانکی سپورٹ کار تھی۔ کٹک سے روانگی کے وقت سب نے یہی زور دیا کہ مَیں اسے فروخت کر دوں کیونکہ فسادات کی وجہ سے اس کا ریل کے ذریعہ پاکستان پہنچنا امرِ محال تھا' لیکن اس کار کے ساتھ کچھ ایسی خوشگوار یادیں وابستہ تھیں کہ اسے بیچنے پر دل رضامند نہ ہوا اور مَیں نے اسے ریل کی ایک بوگی میں مقفل کر کے اللہ توکل کراچی کے لیے بک کروا دیا۔ یہ بوگی کسی نہ کسی طرح جالندھر تک تو ضرور پہنچی، لیکن وہاں پر کسی صاحبِ ذوق کی نظرِ انتخاب اس پر پڑ گئی اور اُس نے کار کو ریل گاڑی سے اُتار لیا۔ اب کراچی میں پیدل جوتیاں چٹخاتے چٹخاتے طبیعت اُکتانے لگی تھی۔ جب انشورنس پالیسی کے پیسے جیب میں آگئے تو دبی دبی اکتاہٹ کا یہ احساس آناً فاناً شدید تکان اور ماندگی میں تبدیل ہو گیا اور کار خریدنے کی خواہش نے دل کو بُری طرح اپنے شکنجے میں کس لیا۔

اب کار کے خریدار کی حیثیت سے مَیں نے کراچی پر نگاہ ڈالی' تو سڑک پر چلنے والی ہر دوسری یا تیسری کار بکنے کے لیے تیار تھی، کیونکہ بمبئ جانے والے بہت سے ہندو ہوائی جہاز یا سمندری جہاز پر سوار ہونے سے پہلے آخری چیز اپنی کار فروخت کیا کرتے تھے۔ ایک ایسے ہی خوش پوشاک، چرب زبان ہندو نوجوان مسٹر وڈوانی سے میری ملاقات سرِ راہ ہوگئی۔ اُس کے پاس پندرہ بیس سال پُرانی شیورلٹ کار تھی، جسے وہ شام کے جہاز پر سوار ہونے سے پہلے فروخت کرنے کی عُجلت میں تھا۔ اُس نے اپنی کار کی مدح میں رُطبُ اللسان ہو کر ایسے ایسے گیت گائے اور سالہا سال سے اُس کی بے عیب خدمت گزاری اور بے لوث وفاداری کے اتنے قصّے سنائے کہ مجھے ایک گونہ افسوس ہونے لگا کہ یہ شخص اپنی اس قدر محبوب اور کار آمد شے کو بہ امرِ مجبوری پیچھے چھوڑ کر جا رہا ہے۔ مَیں نے مسٹر وڈوانی سے قیمت کے متعلق استفسار کیا، تو اُس نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں سے لگا کر بڑا توبہ تلہ کیا، اور قسم کھائی کہ وہ اپنی محبوب کار کی قیمت لگانے کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتا۔ اس کی نظر میں یہ کار بالکل انمول تھی اور وہ پیسہ کمانے کے لیے اسے نہیں بیچنا چاہتا تھا، وہ تو بس ایک ایسے قدردان کی تلاش میں تھا' جسے سپرد کر کے اسے یہ اطمینان ہو کہ اس کی چہیتی موٹر کار واقعی صحیح ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے۔ کسی وجہ سے اُسے میرے چہرے پر قدردانی کی مہر ثبت نظر آئی، اور مَیں بھی اُس کی چرب زبانی کی چکناہٹ پر ایسا پھسلا کہ پانچ ہزار سے شروع کر کے ڈھائی ہزار روپے پر سودا طے کر لیا۔ مسٹر وڈوانی نے مجھے اپنے ساتھ کار میں بٹھایا، اور قدم قدم پر اُس کی خوش رفتاری کی

تعریف وتوصیف کرتا ہوا مجھے ہمارے گھر لے آیا۔ میں نے اسے ڈھائی ہزار روپے نقد ادا کر کے کار کے کاغذات وصول کیے اور وہ بڑی گرم جوشی سے بغل گیر ہو کر رخصت ہو گیا۔

مسٹر وڈوانی کے جانے کے بعد میں نے کار چلانے کی کوشش کی تو اُس نے سٹارٹ ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ اب یہ عُقدہ کھلا کہ انجن سٹارٹ ہونے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ دو چار آدمی اسے کافی دُور تک دھکا دیں۔ انجن چالو ہوتا تھا تو پہیئے رک جاتے تھے۔ پہیئے حرکت میں آتے تھے تو انجن دم توڑ دیتا تھا۔ گیئر بدلنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، اور بریک کبھی لگتی تھی کبھی صاف مکر جاتی تھی۔ میل ڈیڑھ میل چلنے کے بعد پانی جوش میں آکر اُبلنے لگتا تھا اور ہارن کی جگہ اُس کے دروازے اور مڈگارڈ بڑے زور سے بجتے تھے۔ کار کی اگلی پچھلی بتیوں میں سے کوئی بھی کام نہ کرتی تھی اور کئی بار اندھیرے میں موٹر چلانے کے لئے ہم لوگ اُس کے سامنے لالٹین جلا کر لٹکایا کرتے تھے۔

انہی دنوں چودھری غلام عباس صاحب شیخ عبداللہ کی جیل سے رہا ہو کر پاکستان پہنچے تھے۔ کراچی آکر وہ ہمارے ہاں ٹھہرے اور ٹیلی فون پر قائداعظمؒ کو اپنی آمد کی اطلاع دی۔ قائداعظمؒ نے انہیں اگلے روز لنچ پر مدعو کیا اور ساتھ ہی فرمایا کہ اگر انہیں سواری کی ضرورت ہو تو گورنر جنرل ہاؤس کی کار انہیں لینے وقت پر آجائے گی۔ چودھری صاحب ہمارے ہاں کار کھڑی دیکھ چکے تھے، اس لیے انہوں نے عرض کیا کہ سواری کا انتظام ہے اور وہ خود ہی حاضر ہو جائینگے۔

سواری کا جو انتظام موجود تھا، اُس کی اصلیت سے ہم نے چودھری صاحب کو آگاہ کیا تو وہ بولے ''کوئی پرواہ نہیں، ہم ایک گھنٹہ پہلے ہی گھر سے روانہ ہو جائیں گے تاکہ کار کے سارے ناز نخرے اٹھانے کے بعد بھی کافی وقت ہاتھ میں رہے۔''

لنچ کا ٹائم سوا بجے تھا۔ ہم دھکا لگانے والی نفری کار میں بٹھا کر بارہ بجے ہی روانہ ہو گئے۔ اتفاق سے کار کا موڈ ٹھیک رہا، اور ہم ساڑھے بارہ ہی گورنر جنرل ہاؤس پہنچ گئے۔ اے۔ ڈی۔ سی بڑا پریشان ہوا کہ چودھری صاحب اتنی جلدی کیوں آگئے ہیں؟ چودھری صاحب نے اُس کی ڈھارس بندھائی کہ وہ بڑی خوشی سے اے۔ ڈی۔ سی کے کمرے میں بیٹھ کر آدھ گھنٹہ انتظار کر لیں گے۔

''انتظار کی بات نہیں۔'' اے۔ڈی۔سی نے جواب دیا۔ '' قائداعظمؒ کا حکم ہے کہ جب چودھری صاحب

تشریف لائیں، تو وہ خود پورچ میں آکر کار کے دروازے پر اُن کا استقبال کریں گے۔ اس لیے فی الحال آپ واپس چلے جائیں اور ٹھیک ایک بج کر پندرہ منٹ پر پورچ میں پہنچ جائیں۔''

اس گفتگو کے دوران کار کا انجن بند ہو گیا تھا۔ ہم نے دھکا دے کر اسے اسٹارٹ کیا اور باہر آکر گیٹ کے قریب ہی گورنر جنرل ہاؤس کی دیوار کے ساتھ وقت گزارنے کے لئے رک گئے۔ سکیورٹی والے بڑے مُستعِد تھے۔ وہ فوراً ہماری طرف لپکے اور وہاں رکنے کی وجہ پوچھی۔ ہم نے انہیں اصلی صورت حال سے آگاہ کیا، تو وہ حیران ہوئے کہ قائداعظمؒ کا معزز مہمان ایسی پھٹیچر کار پر سوار ہو کر گورنر جنرل ہاؤس آیا ہے۔ سکیورٹی سٹاف کے کچھ لوگوں نے آ آکر چودھری صاحب کے ساتھ عقیدتاً ہاتھ بھی ملائے۔

گورنر جنرل ہاؤس کی دیوار کے ساتھ اس وقفہ انتظار کے دوران چودھری غلام عباس نے کہا کہ ریاست جموں و کشمیر کا جو علاقہ آزاد ہو چکا ہے، وہاں پر نظم و نسق قائم کرنے کے لئے وہ میری خدمات حکومت پاکستان سے مُستعار مانگنا چاہتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض تو نہیں؟ چودھری صاحب نے دراصل میرے منہ کی بات چھین لی، کیونکہ مَیں خود اُن سے یہی درخواست کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ مَیں نے انہیں یقین دلایا کہ مَیں جتنی جلد آزاد کشمیر جا سکوں، اسی قدر اُسے اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھوں گا۔

وقت ہو چکا تھا۔ سکیورٹی کے کچھ سپاہیوں نے بڑی خوشدلی سے کار کو دھکا لگایا اور ہم بڑے زور شور سے پھٹ پھٹ کرتے ٹھیک سوا بجے گورنر جنرل ہاؤس کی پورچ میں جا رُکے۔ عین اُسی لمحے قائداعظمؒ بھی اندر سے برآمد ہوئے۔ انہوں نے بڑی گرمجوشی سے چودھری صاحب کے ساتھ معانقہ کیا اور انہیں بازو سے تھام کو اندر لے گئے۔

ہم نے احتیاطاً کار کا انجن چالو رکھا تھا۔ اس کے شور شرابے میں قائداعظمؒ کا صرف ایک فقرہ سنائی دیا۔

"Ghulam Abbas I am really happy, You are here!"

(ماخوز از شہاب نامہ)

مختصر تعارف

چودھری غلام عباس : تحریک آزادی کے راہنما۔ ان کی ریاست جموں و کشمیر کی آزادی اور ریاست پاکستان کے ساتھ الحاق کی جدو جہد اور قربانیاں جہاد سے کم نہیں ہیں۔

ابراہیم اسمٰعیل چندریگر (آئی آئی چندریگر) : آل انڈیا مسلم لیگ کے اہم "رُکن" قائداعظمؒ کے دستِ راست' آزادی کے بعد پاکستان کی مرکزی کابینہ میں وزیر رہے' صوبہ سرحد اور پھر پنجاب کے گورنر اور دسمبر ۱۹۵۷ء میں پاکستان کے وزیر اعظم بنے۔

قدرت اللہ شہاب : سابق ریاست جموں وکشمیر کے پہلے آئی سی ایس (انڈین سول سروس) ' اُردو ادیب ' گورنر جنرل کے سیکرٹری اور بعد ازاں صدر ایوب خان کے سیکرٹری کے عہدے پر فائز رہے۔

جمیل الدین عالی : ممتاز صحافی ' ادیب اور شاعر۔ ۱۹۴۸ء میں وزارتِ تجارت میں ملازمت اختیار کی۔ بعد ازاں نیشنل بنک آف پاکستان سے وابستہ ہو گئے' بطور پلاننگ اینڈ ڈیویلپمنٹ ایڈوائزر' پاکستان بینکنگ کونسل سے ۱۹۸۸ء میں ریٹائر ہوئے۔

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیں۔

(الف) مصنف کو ارضِ پاک پر کس انداز سے اُترنے کی توقع تھی؟

(ب) امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ کے معاملات سمجھنے کے لیے مصنف نے کیا کیا؟

(ج) قائداعظمؒ کے اے ڈی سی نے چودھری غلام عباس کو اپنے کمرے میں کیوں نہ بیٹھنے دیا؟

(د) مصنف کے ہندو مالک مکان نے اپنے طوطے کو کیا سکھا رکھا تھا؟

(ہ) ہندو مالک مکان نے اپنی رقم ماں جی کے پاس کیوں امانت رکھی؟

۲۔ سبق کے حوالے سے درست لفظ لکھ کر جملے مکمل کریں:

(الف) قائداعظمؒ نے چودھری غلام عباس کے ساتھ ....۔

(ہاتھ ملایا ، معانقہ کیا)

(ب) منیجر نے پالیسی واپس لے کر مجھے ....ادا کر دیے۔

(دو ہزار سات سو روپے ، تین ہزار سات سو روپے)

(ج) مالک مکان نے طوطے کو..................میں گالیاں سکھا رکھی تھیں۔

(ہندی زبان میں ، سندھی زبان میں)

(د) الھڑ' بے باک اور منہ زور اسسٹنٹ جو فائل گم کر بیٹھا تھا وہ..................تھا۔

(مشتاق یوسفی ، جمیل الدین عالی)

(ہ) اُن دنوں پاکستان میں اچانک..................کی شدید قلت پیدا ہو گئی۔

(چینی اور کوئلے ، پیٹرول اور ڈیزل)

(ز) ہندو مالک مکان، مکان اور دکان..................کرنے کے لیے رُکا ہوا تھا۔

(صاف ، فروخت)

(ح) ایک دن میں نے..................کھولا تو اُس میں صرف سولہ روپے تھے۔

(صندوق ، بٹوہ)

(ط) مصنف کی گاڑی بوگی میں سے..................میں اُتار لی گئی۔

(جالندھر ، بھٹنڈہ)

۳۔ درج ذیل الفاظ/محاورات کے معنی لکھ کر جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے۔

دخل در معقولات ، شُد بُد ، کلیجہ منہ کو آنا ، ٹکا سا جواب دینا ، خمیازہ بھگتنا ، ہاتھوں کے طوطے اُڑ جانا

رسی جل گئی مگر بل نہ گیا ، جوئے شیر لانا ، مُوشگافیاں

۴۔ درج ذیل الفاظ پر اعراب لگائیں۔

زود رنجی نعمت غیر مترقبہ استغفراللہ سبحان اللہ حفظ ماتقدم

سابقہ/لاحقہ کسی لفظ سے پہلے جب کوئی حرف یا لفظ لگا کر نیا لفظ بنایا جاتا ہے تو پہلے لگنے والا حرف سابقہ کہلاتا ہے۔
مثلاً پڑھ سے پہلے اَن لگا کر نیا لفظ ان پڑھ بنایا جاتا ہے "ان" سابقہ ہے۔
اسی طرح جب کسی لفظ کے بعد کوئی حرف یا لفظ لگا کر لفظ بنایا جائے تو بعد میں لگنے والا حرف لاحقہ کہلاتا ہے۔
مثلاً مسلم کے بعد آباد لگانے سے مسلم آباد۔ "آباد" لاحقہ ہے

۵۔ درج ذیل سابقوں اور لاحقوں کے ساتھ الفاظ لگا کر کم از کم پانچ پانچ نئے الفاظ بنائیں۔

جواں ، خوش ، خواہ ، افزاء ، گیر

۶۔ درج ذیل بیانات کی نشاندہی درست (✓) اور غلط (X) کے نشانات لگا کر کریں۔

(الف) اُن دنوں پاکستان میں چینی اور پتی کی قلت پیدا ہو گئی۔

(ب) قائداعظم محمد علی جناحؒ وقت کے بہت پابند تھے۔

(ج) قدرت اللہ شہاب خوشامد پسند تھے۔

(د) چودھری غلام عباس شیخ عبداللہ کی جیل سے رہا ہو کر پاکستان پہنچے تھے۔

(ہ) مصنف نے شیورلیٹ کار تین ہزار میں خریدی۔

(و) مصنف ۱۳ ستمبر ۱۹۴۷ء کو بھارت سے پاکستان پہنچے۔

۷۔ چودھری غلام عباس کی کراچی آمد اور قائداعظمؒ سے ملاقات کا حال اپنے الفاظ میں لکھیں۔

سرگرمی

سبق سے پانچ مرکب اضافی تلاش کر کے لکھیں۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ طلبہ کو سوانح عمری یا خود نوشت لکھنے کی اہمیت سے آگاہ کریں۔

۲۔ اُردو زبان میں لکھی گئی دیگر سوانح عمریوں سے بھی متعارف کرائیں۔

۳۔ قدرت اللہ شہاب کے نثری اسلوب سے طلبہ کو آگاہ کریں۔